بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

مخلوط انتخاب کا شوشہ

پروفیسر خورشید احمد

کسی پہلو سے بھی اسے ایک قوم کی خوش بختی قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اس کا ایک بااثر طبقہ طے شدہ امور کو بار بار متنازع بنانے کی کوشش کرے اور ملک و ملت کو ایک نہ ختم ہونے والے بحث و مباحثے میں الجھائے رکھ کر ذہنی فضا کو مسموم اور پراگندہ (confuse) کرنے کا مرتکب ہو۔ جو دانش ور' صحافی اور سیاست کار اس کے مرتکب ہو رہے ہیں' ان کی مثال' قرآن کی زبان میں' اس عورت کی سی ہے جس نے آپ اپنی محنت سے سوت کاتا اور پھر آپ ہی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا جس سے اللہ نے پناہ کا حکم دیا ہے (وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا النحل ۱۶:۹۲)۔

پاکستان کو مسلمانوں کی حالیہ تاریخ میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ یہ ملک ایک شعوری اور عوامی جمہوری تحریک کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے اور یہ تحریک برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی جدوجہد تھی۔ بلاشبہ پاکستان ان تمام انسانوں کا ملک ہے جو یہاں آباد ہیں اور ایک اجتماعی معاہدے کے تحت سب کے حقوق محترم ہیں لیکن اس حقیقت سے صرف نظر ممکن نہیں کہ یہ ملک نہ کسی فوجی کارروائی کے تحت وجود میں آیا اور نہ ہی اس کے قیام میں برعظیم کے مسلمانوں کے علاوہ کسی دوسری قوم یا گروہ کا کوئی حصہ تھا۔ پھر یہ صرف ان مسلمانوں کی کاوش کا حاصل بھی نہیں جو ان علاقوں کے باسی تھے اور جہاں آزادی کا سبز پرچم لہرایا بلکہ یہ جدوجہد برعظیم کے تمام مسلمانوں نے کی اور یہ ملک ان سب کی قربانیوں کا حاصل ہے اور اس پر سب کا برابر کا حق ہے۔ سب سے بڑھ کر' یہ محض ایک علاقے کی آزادی کا مسئلہ نہ تھا بلکہ برعظیم کے سیاسی مسئلے کا ایک حل اور برعظیم میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے لیے ایک واضح منزل اور اس تک پہنچنے کے لیے ایک کھلی شاہراہ کے حصول کی جدوجہد تھی۔ یہ تحریک اللہ' ملت اسلامیہ پاکستان اور خود

تاریخ سے ایک عہد اور میثاق تھی جس کے نتیجے میں پاکستان کی آزاد مسلم مملکت وجود میں آئی۔

تقسیم ہند کا منصوبہ واضح طور پر نظریاتی بنیادوں پر تقسیم ملک کی تقسیم کا عمل تھا جسے برطانوی حکومت، مسلمانان پاک و ہند اور کانگریس نے طویل بحث و مجادلہ اور افہام و تفہیم کے بعد قبول کیا اور ایک عمرانی معاہدے کے ذریعے دو آزاد مملکتیں وجود میں آئیں جن کا اپنا اپنا واضح تشخص تھا۔ پاکستان کے اسی تشخص کو قرارداد مقاصد اور پھر ۱۹۵۶ء اور ۱۹۷۳ء کے دستور میں قانونی اور عملی شکل دی گئی۔ اس کے تین ستون ہیں جو ملت کے اجماع کا مظہر ہیں: یعنی مملکت کا اسلامی تشخص، اس کا جمہوری کردار اور اس کا وفاقی نظام۔ یہ تینوں بنیادیں متفق علیہ اور غیر متنازع ہیں۔ یہ باہم مربوط اور ایک دوسرے کی مضبوطی کا باعث ہیں اور ان کی اہمیت اسی ترتیب سے ہے جس میں یہ قرارداد مقاصد اور دستور میں مرقوم ہیں۔ کوئی ایسا اقدام جو ان میں سے کسی کو بھی مضمحل یا کمزور کرے یا جس کے نتیجے میں ان میں کوئی شگاف آجائے وہ پاکستان سے بے وفائی اور تحریک پاکستان کے شہدا سے غداری کے مترادف ہے۔ ہر قوم کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی بنیادوں کی حفاظت کرے اور جو بھی ان پہ تیشہ چلانے کی جرات کرے، اس ہاتھ کو کاٹ ڈالے اور اس کی ضرب کو غیر مؤثر بنا دے۔

طریق انتخاب کا مسئلہ ان تینوں بنیادوں سے متعلق ہے۔ جو حضرات بڑا معصوم چہرہ بنا کر محض لبرل جمہوریت اور مساوات کے نام پر جداگانہ انتخاب کی جگہ مخلوط انتخاب کی بات کر رہے ہیں وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر پاکستان کی بنیادوں پر تیشہ چلا رہے ہیں اور انھیں یہ کھیل کھیلنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ناموس رسالتؐ کے سلسلے میں بھی یہی کھیل کھیلا گیا اور اب طریق انتخاب کے سلسلے میں ایسی ہی مذموم کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ ساری حرکتیں ایک مخصوص گروہ کی طرف سے ہو رہی ہیں جو کبھی جمہوریت کی دہائی دیتا ہے، کبھی دعویٰ کرتا ہے کہ ان امور کا کوئی تعلق دین سے نہیں، کبھی اقلیتوں کے حقوق کی دہائی دی جاتی ہے اور کبھی بنیادی حقوق کا واویلا کیا جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ خواتین کمیشن کی رپورٹ میں بھی یہ شوشہ چھوڑنے سے گریز نہیں کیا جاتا۔ اس سلسلے میں وہ طبقہ سب سے زیادہ پیش پیش ہے جو این جی اوز کے روپ میں مغربی تہذیب اور اقدار کو فروغ دینے کے لیے سرگرم ہے اور جسے عالمی سیکولر قوتوں کی پشت پناہی حاصل ہے لیکن پاکستان ان تمام قوتوں کے علی الرغم اللہ کے فضل و کرم اور مسلمانان برعظیم کی عوامی جدوجہد کے ذریعے وجود میں آیا ہے اور ان شاء اللہ تمام ریشہ دوانیوں کے باوجود اپنی اصل بنیادوں پر قائم رہے گا۔ البتہ ہر فتنے کو سمجھنا اور اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہے کہ یہی وہ راستہ ہے جس سے زندہ قومیں اپنے مقاصد اور عزائم کی تکمیل کرتی اور ان کی حفاظت اور ترقی کا سامان کرتی ہیں۔

برعظیم کی تاریخ میں طریق انتخاب کے مسئلے نے بیسویں صدی کے شروع ہی میں اہمیت اختیار کر لی تھی۔ جب سرکاری اداروں میں عوامی نمایندگی کا سوال اٹھا تو فطری طور پر یہ سوال سامنے آیا کہ کس کی نمایندگی کون کرے گا اور اس کے لیے اصل اور بنیاد کیا ہوگی؟ انگریز اور کانگریس کی ہندووانہ سیکولر قیادت تمام ہندستانیوں کے لیے ایک ہی طریق انتخاب کی بات کر رہے تھے جب کہ مسلمان اس بات کے دعوے دار تھے کہ وہ ایک جدا قومی تشخص کے حامل ہیں اور چونکہ ان کے مقابلے میں ہندو آبادی تین گنا زیادہ ہے اس لیے مذہب' تہذیب و ثقافت اور جداگانہ قومی مفاد کو نظرانداز کر کے ایک نام نہاد نیوٹرل (neutral) بنیاد پر مخلوط انتخاب کا طریقہ عملاً ان کو حق رائے دہی سے محروم (disenfranchisement) کرنے کے مترادف ہوگا۔ ابھی تقسیم ملک کی کوئی بات نہیں اٹھی تھی اور ہندو مسلم اتحاد کی لے بڑے اونچے سروں میں بلند کی جا رہی تھی لیکن شرکت اقتدار اور انتخاب کی بات کے اٹھتے ہی مسلمانوں نے اپنے جداگانہ تشخص کا اظہار کیا اور بالآخر ۱۹۰۹ء میں مشترک بیلٹ کی جگہ جداگانہ نمایندگی کے اصول کو تسلیم کیا گیا۔ سائمن کمیشن اور نہرو رپورٹ (۲۹-۱۹۲۸ء) کے موقع پر پھر یہ مسئلہ پوری قوت سے اٹھایا گیا۔ کانگریس اور خصوصیت سے پنڈت نہرو نے اس کی زبردست مخالفت کی لیکن مسلمانوں نے اپنے جداگانہ تشخص پر کوئی سمجھوتہ نہ کیا۔ بعض مسلمان قائدین جو قبل ازیں اس بارے میں متردد تھے' وہ بھی اب کھل کر اس کی تائید میں سینہ سپر ہو گئے اور مسلمان قوم کے اجتماعی فیصلے کو تسلیم کرانے کے لیے ڈٹ گئے بلکہ اس کے منطقی تقاضے یعنی مسلم اکثریت اور ہندو اکثریت کی بنیاد پر ملک کی تقسیم کے نصب العین پر جمع ہونے لگے۔

سیکولر قوتوں کا موقف یہ تھا کہ مذہب ایک انفرادی معاملہ ہے۔ اس کا سیاست' ریاست اور انتخابی عمل سے کوئی تعلق نہیں جبکہ مسلمانوں کا موقف یہ تھا کہ ان کا مذہب محض انفرادی عقیدے اور عبادات تک محدود نہیں بلکہ وہی ان کی اجتماعیت کی بنیاد' ان کی قومیت کی اساس اور ان کے اجتماعی کردار کا صورت گر ہے۔ مغرب کی لبرل اور سیکولر جمہوریت مسلمان کی منزل نہیں ہو سکتی۔ مسلمان جس جمہوریت کے قائل ہیں وہ اللہ کی حاکمیت اور شریعت کے فریم ورک میں قائم ہوتی ہے اور دین اور سیاست دو جداگانہ دنیاؤں سے متعلق نہیں بلکہ ان کی سیاست بھی دین کی اسی طرح پابند ہے جس طرح ان کی عبادت۔ اقبال نے اس نکتے کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے:

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولؐ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اقبال نے اپنے ۱۹۳۰ء کے تاریخی خطبے میں تو گویا سمندر کو کوزے میں بند کر دیا۔ انھوں نے مغربی فکر و تہذیب اور اسلامی نظریہ اور تاریخ کے فرق کو بڑے واضح انداز میں بیان کیا جو تحریک پاکستان کی بنیاد اور اس کی علت غائی (raison detre) بن گئی:

> سوال یہ ہے کہ آج جو مسئلہ ہمارے پیش نظر ہے اس کی صحیح حیثیت کیا ہے؟ کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ ہے اور آپ بھی یہ چاہتے ہیں کہ ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں لیکن اس کے نظام سیاست کی بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا......
>
> لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واردات مذہب کی حیثیت جیسا کہ قرآن پاک میں ان کا اظہار ہوا ہے، اس سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ محض حیاتی نوع کی واردات نہیں ہیں کہ ان کا تعلق صرف صاحب واردات کے اندرون ذات سے ہو، لیکن اس کے باہر اس کے گردوپیش کی معاشرت پر ان کا کوئی اثر نہ پڑے۔ برعکس اس کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جن کے اولین نتیجے سے ایک ایسے نظام سیاست کی تاسیس ہوئی جس کے اندر قانونی تصورات مضمر تھے اور جن کی اہمیت کو محض اس لیے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بنیاد وحی و الہام پر ہے۔ لہٰذا اسلام کے مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے، الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کے ترک بھی لازم آئے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کے لیے بھی کسی ایسے نظام سیاست پر غور کرنے کے لیے آمادہ ہوگا جو کسی ایسے وطنی یا قومی اصول پر مبنی ہو جو اسلام کے اصول اتحاد کی نفی کرے (Thoughts and Reflections of Iqbal, p 166-167)

اسلام کے اس مخصوص مزاج اور تاریخی کردار کا تقاضا تھا کہ ریاستی نظام کی بنیاد اسلامی تشخص اور مسلمانوں کی نظریاتی وحدت پر ہو اور اس نظام میں دوسری قوموں اور گروہوں کو ان کے تشخص کے مطابق زندہ رہنے، ترقی کرنے اور اجتماعی کردار ادا کرنے کا موقع دیا جائے۔ مسلم ریاست اسی نظریاتی شعور پر اپنا اجتماعی اور سیاسی نظام قائم کرتی ہے۔ نہ مسلمانوں کے تشخص کو کمزور کیا جاتا ہے اور نہ دوسری قوموں کو اجتماعیت کے نام پر ان کے تشخص سے محروم کیا جاتا ہے۔ یہ یک قومی ریاست نہیں کثیر قومی ریاست ہے

(state of nationalities) اور اس طرح ایک معتبر کثیر قومی ہیئت (pluralism) کی بنیاد پر اجتماعی تعاون اور استحکام حاصل کیا جاتا ہے۔ دولت عثمانیہ میں تنظیمات کا نظام اسی کثیر قومی ہیئت کی ایک تاریخی مثال ہے۔ برعظیم میں جداگانہ طریق انتخاب کے ذریعے ایک مختلف سیاسی تناظر میں اسی مقصد کو حاصل کیا گیا اور آزادی کے بعد انھی مقاصد اور اہداف کے حصول کے لیے پاکستان کے مسلمانوں نے جداگانہ انتخاب کے طریقے کو ایک ایسی شکل دینے کی کوشش کی کہ مسلم قوم کی نمایندگی بھی بھرپور انداز میں ہو سکے اور دوسری

مخالفت کے باوجود لوکل باڈیز میں مخلوط انتخاب جاری کرنے کا قانون پاس کیا۔ کیا جمہوری حکومت کا یہی شیوہ ہوا کرتا ہے کہ جس قوم یا فرقے کے لیے چاہے اپنی پسند اور مرضی کے مطابق قانون وضع کرے اور اس قوم و فرقے کے نمایندوں کی مرضی اور منشا کا کوئی لحاظ نہ رکھے؟ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ جس طرح ہر شخص کو ووٹ کا حق حاصل ہونا چاہیے اسی طرح امیدوار بننے کا حق بھی حاصل ہونا چاہیے۔ مخلوط انتخاب کی صورت میں جو امیدوار کامیاب ہوں گے وہ غیر قوم یعنی اکثریت کے ووٹوں سے کامیاب ہوں گے۔ مسلمانوں کی خواہش ہے کہ ان کا نمایندہ وہ ہو جسے خود مسلمانوں کے زیادہ سے زیادہ ووٹ ملے ہوں' نہ یہ کہ ووٹ تو دوسروں سے ملے ہوں اور وہ نمایندہ مسلمانوں کا ہو" (روزنامہ انقلاب ' لاہور ' ۱۲ جون ۱۹۳۸ء۔ گفتار قائداعظم' مرتبہ: احمد سعید' ص ۲۱۲-۲۱۶)

قائداعظم کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء والی تقریر کو اس کے مخصوص سیاسی پس منظر اور قائداعظم کے اسی موضوع پر دو سو سے زیادہ اقوال کو نظرانداز کر کے' ایک گروہ متحدہ قومیت اور مخلوط انتخاب کے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو مسلمانوں کی پوری تاریخ' اور خصوصیت سے برعظیم میں قیام پاکستان سے قبل اور اس کے بعد کے حقائق و حالات کے خلاف علم بغاوت ہے۔ طریق انتخاب کے مسئلے کا تعلق ایک قوم اور گروہ کے اس حق سے ہے کہ اس کی نمایندگی وہ افراد کریں جو اس میں سے ہوں اور اس کے عقائد و نظریات' پروگرام اور عزائم' تہذیب و اقدار اور ترجیحات کی صحیح نمایندگی کر سکیں۔ اس کا تعلق ملک کی شہریت سے نہیں۔ شہری تو ہر عمر کے لوگ ہوتے ہیں لیکن ووٹ کا حق صرف ایک خاص عمر تک پہنچنے والوں ہی کو ملتا ہے۔ اسی طرح مختلف عقائد' تصورات اور تہذیبی و مذہبی تشخص رکھنے والے افراد ملک کے شہری اور برابر کے شہری ہو سکتے ہیں لیکن نمایندگی اور پالیسی سازی پر اثراندازی کے باب میں انصاف کے تقاضے اسی وقت پورے ہو سکتے ہیں جب ہر تہذیبی اور مذہبی کیمونٹی کی نمایندگی اس کے اپنے لوگ کریں۔ اسے حاصل کرنے کے لیے جداگانہ انتخاب کا طریقہ ایک معقول اور فطری طریقہ ہے۔ متناسب نمایندگی کے نظام کے ذریعے بھی یہ مقصد ایک حد تک حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مگر مخلوط انتخاب تو نمایندگی کا وہ بھونڈا اور ظالمانہ نظام ہے جس کے ذریعے دینی' نظریاتی اور تہذیبی تشخص کی نفی ہوتی ہے اور محض ووٹوں کی ہیراپھیری اور نمبروں کی سیاست کے ذریعے ایک طبقے کو سب پر اپنی بالادستی قائم کرنے کا مؤثر حربہ مل جاتا ہے اور یک رنگی اور مساوات کے نام پر حقیقی تنوع کی نفی کی جاتی ہے۔

مسلمان بحیثیت قوم نہ اس پالیسی کو اس وقت صحیح سمجھتے تھے جب وہ برعظیم میں اقلیت میں تھے اور نہ اس وقت صحیح سمجھتے ہیں جب وہ ایک آزاد مملکت میں اکثریت میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی اور نظریاتی قوتوں نے جداگانہ طریق انتخاب کو پاکستان کے سیاسی نظام اور دستور میں قائم رکھنے کی کوشش کی اور صرف

سیکولر عناصر اور خصوصیت سے کانگریس کے حامیوں اور مشرقی پاکستان کے ہندوؤں نے مخلوط انتخاب کے لیے سازشیں کیں۔ علماے کرام نے ۱۹۵۱ء میں اسلامی ریاست کے جو ۲۲ اصول مرتب کیے ان میں جداگانہ انتخاب کو بنیاد بنایا گیا۔ (ملاحظہ ہو اصول نمبر ۳، ۵، ۱۰ اور ۱۱)۔ اسی طرح ۱۹۵۳ء کی دستوری سفارشات میں علماے کرام نے اسی اصول کی تائید کی۔ خود لیاقت علی خاں کی بنیادی اصولوں کی رپورٹ (۱۹۵۰ء)، ناظم الدین رپورٹ (۱۹۵۲ء)، محمد علی بوگرہ رپورٹ (۱۹۵۴ء) میں جداگانہ اصول ہی کی سفارش کی گئی۔

مشرقی پاکستان کے ۱۹۵۴ء کے انتخاب اسی اصول پر منعقد ہوئے اور جگتو فرنٹ کے ۲۲ نکات میں بھی اس کا کوئی ذکر نہ تھا۔ البتہ ایک بار مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کو مشرقی پاکستان اسمبلی اور مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں میں سے سیکولر عناصر سے گٹھ جوڑ کر کے جو توازن طاقت (leverage) حاصل ہوا اس کا فائدہ اٹھا کر انھوں نے اس اصول پر تیشہ چلانے کی کوشش کی۔ ۱۹۵۶ء کے دستور کے تحت اس مسئلے پر رائے دیتے ہوئے مغربی پاکستان کی اسمبلی نے ۳۱۰ ارکان کے ایوان میں ۳۰۰ ارکان کی اکثریت نے جداگانہ انتخاب کے حق میں ووٹ دیا۔ مشرقی پاکستان کی اسمبلی میں مسلمانوں کی اکثریت نے جداگانہ انتخاب کے حق میں ووٹ دیا، البتہ ۶۰ ہندو ووٹوں کا سہارا لے کر عوامی لیگ نے معمولی اکثریت سے مخلوط انتخاب کے حق میں اکثریت حاصل کرلی اور اس طرح نظام انتخاب میں یہ بارودی سرنگ لگ گئی جس نے، جیسا کہ خطرے کا اظہار کیا گیا تھا، بنگالی قومیت کو فروغ دیا اور بالآخر پاکستان دولخت ہوگیا۔ مولانا مودودی نے ۱۹۵۵ء میں اپنے ایک بصیرت افروز مضمون میں اس خدشے کا برملا اظہار کیا تھا کہ اگر مخلوط انتخاب کے طریقے کو ملک پر مسلط کیا گیا تو سب سے پہلے مشرقی پاکستان میں بنگالی قومیت کا فتنہ اٹھے گا اور پھر مغربی پاکستان بھی اس کا نشانہ بنے گا۔

(Islamic Law and Constitution by Maulana Maudoodi, p 331)

ڈاکٹر وحید قریشی اس مسئلے کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مشرقی پاکستان میں علیحدگی کے رجحانات کو جن عوامل نے تقویت دی ان میں ایک طریقہ انتخاب تھا۔ حکومت پاکستان نے عیسائیوں کا پیش کردہ جداگانہ انتخاب رد کر کے مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کا پیش کردہ مخلوط انتخاب قبول کر لیا تھا۔ نتیجے کے طور پر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان کے نمایندوں پر ہندو ووٹوں کی گرفت مضبوط ہوتی گئی اور اس نے علیحدگی کی تحریک کو مضبوط کیا (Ideological Foundation of Pakistan, p 193)۔

یہ اس لیے ہوا کہ ڈاکٹر وحید قریشی کے مطابق:

> جداگانہ انتخاب ختم کر کے بالواسطہ طور پر تسلیم کرلیا گیا کہ مشرقی پاکستان کے ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں (ص ۲۵)۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسندی کے رجحان کو پروان چڑھانے والے عوامل متعدد تھے۔ جن عوامل نے اہم کردار ادا کیا ان میں مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے سیاسی قائدین اور افسرشاہی کا رویہ' ضرورت سے زیادہ مرکزیت کا فروغ' وسائل کی تقسیم میں ناانصافی اور جمہوری عمل کا تعطل اور تمام علاقوں کے لوگوں کی اقتدار میں شرکت (political participation) میں کمی کا بڑا حصہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس تاریخی حقیقت کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ ملک کی نظریاتی بنیاد کی کمزوری' اور خصوصیت سے نظام انتخاب کی تبدیلی کے ذریعے اسلامی قومیت پر ضرب کاری کا حالات کو خراب کرنے میں بڑا دخل ہے جس کا مقامی ہندو قوتوں اور بھارت نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ مخلوط انتخاب کے نظام کا اس میں بڑا اہم کردار رہا ہے۔ مولانا مودودیؒ نے سقوط ڈھاکہ کے بعد ایک تفصیلی انٹرویو میں حالات کا بے لاگ جائزہ لیا تھا۔ ان کے یہ الفاظ گہرے غور و فکر کے متقاضی ہیں:

> علیحدگی کی طرف ایک اور قدم اور بڑا مؤثر قدم مخلوط انتخاب تھا۔ ۱۹۵۶ء میں جس طرح پاکستان کی پارٹیوں نے مل ملا کر ایک دستور بنایا تھا اور اس میں اسلام کی بنیاد پر نظام حکومت تعمیر کرنے کی جو بنا رکھی گئی تھی' اسے اگر کام کرنے کا موقع دیا جاتا تو شاید ان اسباب کی تلافی کی جا سکتی تھی جو ملک کے دونوں حصوں کو علیحدگی کی طرف لے جا رہے تھے۔ لیکن سکندر مرزا صاحب اور سہروردی صاحب نے زبردستی مخلوط انتخاب کا قانون پاس کر کے اس دستور میں ایک ایسی نقب لگا دی جس سے وہ پاکستان کی وحدت برقرار رکھنے کے لیے کوئی خدمت انجام دینے کے قابل نہ رہا۔ ہم نے اس وقت یہ سمجھانے کی انتہائی کوشش کی کہ مخلوط انتخاب پاکستان کے لیے مہلک ثابت ہوگا۔ اس کے بجائے جداگانہ انتخاب باقی رہنا چاہیے۔ بلکہ وہ بھی اس طرز کا نہ ہونا چاہیے جو انگریزوں نے ہندوستان میں رائج کیا تھا کہ ایک طرف مسلمان تنہا ہوں اور دوسری طرف تمام غیر مسلموں کو ملا کر ایک کر دیا جائے جس کا پورا فائدہ اونچی ذات کے ہندوؤں کو حاصل ہو۔ بلکہ مسلمان' اونچی ذات کے ہندو' آدی باسی ہندو (شیڈولڈ کاسٹ) عیسائی' بودھ' سب کے الگ الگ حلقہ ہاے انتخاب ہونے چاہییں اور آبادی کی بنیاد پر ان کو جداگانہ نمایندگی دینی چاہیے۔ لیکن ان لوگوں کے پیش نظر یہ تھا کہ پاکستان میں اسلامی حکومت کسی طرح نہ چلنے پائے اور یہ ایک سیکولر ریاست ہی بن کر رہے۔ اس لیے مشرقی اور مغربی پاکستان کے مسلمانوں کی سخت مخالفت کے باوجود انھوں نے مخلوط انتخاب کا قانون پاس کر کے چھوڑا۔ یہ اگرچہ اصولی حیثیت سے پورے پاکستان ہی کے لیے غلط تھا' لیکن عملاً اس کا اصل نقصان مشرقی پاکستان کو پہنچا تھا (سید ابوالاعلیٰ مودودی' روزنامہ جسارت' ۹ دسمبر ۱۹۷۲ء بحوالہ مولانا مودودی کے انٹرویو' اول' ص ۵۱۵-۵۱۶)۔

مخلوط انتخاب کے نتیجے میں سیکولر قوتوں کی تقویت اور متحدہ قومیت کے علم برداروں کی بالآخر کامیابی

ایک تاریخی حقیقت ہے۔ پاکستان کو دولخت کرنے اور برعظیم کے نظریاتی نقشے کو تہ و بالا کرنے میں اس تاریخی بھیانک (blunder) کا بڑا دخل ہے۔

یہ تو پاکستان کا حشر ہوا۔ بھارت کی کہانی بھی بڑی سبق آموز ہے۔ آزادی کے بعد کانگریس نے مخلوط انتخاب مسلط کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش کی۔ دستور ساز اسمبلی کی متعلقہ کمیٹی نے بڑی رد و کد کے بعد جداگانہ انتخاب کو تو ختم کرنے کی سفارش کی لیکن مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے لیے اسمبلی میں نشستیں مقرر کرنے کا مشورہ دیا۔ اس پر کمیٹی میں اتفاق رائے حاصل کیا گیا مگر دستور ساز اسمبلی میں پھر قلابازی کھائی گئی اور اقلیتوں کے لیے نشستیں مخصوص کرنے کی دفعہ خارج کر دی گئی۔ واضح رہے کہ اس سے پہلے لیاقت نہرو معاہدے میں بھی ایسی ہی عیاری کی گئی تھی۔ اصل معاہدے میں اقلیتوں کے لیے دونوں ملکوں میں نمایندگی کی ضمانت پر دونوں وزراے اعظم میں اتفاق ہوا تھا۔ این وی گیڈجل (N.V.Gadgil) نہرو کی کابینہ میں وزیر تھا اور معاہدے کے مذاکرات میں بھی شریک' اپنی کتاب "Government from Inside" میں اعتراف کرتا ہے:

> اصل معاہدے میں دو پیراگراف تھے جس میں مسلمانوں کے لیے ان کی آبادی کے تناسب سے تمام ملازمتوں میں نشستوں کے تحفظ کو' اور ہندستان کی تمام ریاستوں میں نمایندگی کو تسلیم کیا گیا تھا۔ ایسی ہی دفعات مرکزی اسمبلی کے لیے تجویز کی گئی تھیں (ص ۸۶)۔

شیخ محمد اکرام پاکستانی وفد میں شامل تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس نوعیت کی تجویز مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کے بارے میں بھی معاہدے میں شامل تھی مگر پنڈت نہرو اور لیاقت علی خاں کے درمیان اتفاق کے باوجود سردار پٹیل اڑ گئے اور بقول گیڈجل بھارتی کابینہ نے اس حصے کو تسلیم نہیں کیا اور پنڈت نہرو کے اس اصرار کے باوجود کہ وہ لیاقت علی خان سے اس اصول پر اتفاق کر چکے ہیں' کابینہ نے اسے ماننے سے انکار کر دیا (گیڈجل' ص ۸۷)۔ کابینہ کا فیصلہ تھا کہ: ان دونوں تجاویز کو پورے کا پورا مکمل مسترد کر دیا جائے (دیکھیے: Modern Muslim India and the Birth of Pakistan از شیخ محمد اکرام' لاہور' ۱۹۹۰ء' ص ۳۶۲)۔

> اور یہ سب سیکولرزم کے نام پر!

> اقلیتوں کی نمایندگی کی ایک دوسری شکل متناسب نمایندگی کی بنیاد پر انتخاب کے نظام میں ممکن تھی۔

نہرو رپورٹ (۱۹۲۸ء) میں اس طریق انتخاب کا ذکر ہے بلکہ اس کی افادیت کا اعتراف بھی ہے۔

> ہم اس نظام میں بڑی کشش محسوس کرتے ہیں اور اس رائے کے حامل ہیں کہ مختلف طبقوں کے دعووں اور اندیشوں کے حوالے سے یہ واحد معقول اور منصفانہ راستہ ہے۔ اس میں ہر اقلیت کے

میں بیٹھا تھا جن کی مالی حالت کمزور تھی اور ان میں سے بعض کے پاس اتنا کپڑا بھی نہ تھا کہ ستر عورت کر سکتے۔ وہ ایک دوسرے کے جسم کو اپنے لیے ساتر بناتے تھے۔ ایک شخص قرآن پاک پڑھ رہا تھا اور سب سن رہے تھے۔ اس دوران میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور کھڑے ہو گئے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے تو قاری خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد آپؐ نے حلقے پر سلام کیا اور پوچھا: آپ لوگ کیا کر رہے تھے۔ ہم نے عرض کیا کہ ہمارے قاری قرآن پڑھ رہے تھے اور ہم کتاب اللہ کو سن رہے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کا شکر ہے جس نے میری امت میں ایسے لوگ پیدا فرمائے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم فرمایا کہ میں ان کی معیت اختیار کروں۔ یہ فرما کر آپؐ ہمارے درمیان تشریف فرما ہو گئے تاکہ آپؐ اپنی ذات اقدس کو ہماری مجلس میں برابر کا شریک کر دیں۔ پھر آپؐ نے ہاتھ مبارک کے اشارے سے حلقے کو درست کرنے کی طرف اشارہ فرمایا' جس کے نتیجے میں تمام لوگوں کے چہرے دکھائی دینے لگے۔ میں وہ واحد خوش قسمت تھا جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہچانتے تھے۔ اس کے بعد آپؐ نے ارشاد فرمایا: اے ہجرت کرنے والے فقیرو! خوش خبری قبول کرو کہ قیامت کے روز تمھیں "نور تام" نصیب ہو گا۔ تم مال داروں سے آدھا دن قبل جنت میں داخل ہو گے۔ آدھا دن پانچ سو سال کا ہو گا (ترمذی' ابوداود)۔

اسلامی روایت میں فقر کی بڑی اہمیت ہے۔ جدید دور میں معاشی خوش حالی قبلہ و کعبہ بن گئی ہے۔ اسلامی فکر میں معاشی خوش حالی ممنوع نہیں' لیکن اسے نصب العین' اور زندگی کا مطلوب و مقصود بنا لینا بھی روا نہیں۔ قناعت اور شکر ہمارے وہ ایسے تصورات ہیں جن سے مغربی دنیا واقف نہیں۔ اجتماعی زندگی میں ان کی عملی اہمیت پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

ایسے لوگ جو علم دین کے حصول میں' قرآن کے ذکر میں اس طرح مشغول ہوں کہ عرف عام میں انھیں اپنی دنیا کی بالکل فکر نہ ہو' اس حد تک کہ لباس تک مناسب نہ ہو' ہم لوگ معلوم نہیں ایسے لوگوں کو کیا سمجھیں اور مشورہ دیں' اللہ کے رسولؐ نے تو انھیں مال داروں سے پانچ سو سال قبل جنت میں جانے کی خوش خبری دی اور خود ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔

○

حضرت کعب بن عجرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں حاضر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ آپؐ کی حالت بدلی ہوئی ہے۔ عرض کیا: میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں' میں دیکھ رہا ہوں کہ آپؐ کی حالت بدلی ہوئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: تین دن ہو گئے ہیں پیٹ میں کوئی ایسی چیز نہیں گئی جو کسی ذی روح کے پیٹ میں جاتی ہے۔ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں'

سازشیں کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، نہ بھارت میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کی حالت سے کوئی سبق لینے کے لیے تیار ہیں اور نہ خود اپنی تاریخ سے۔

ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اصل مسئلہ ریاست اور دین کے تعلق اور ملکی سیاست میں دین کے کردار کا ہے۔ طریق انتخاب کا مسئلہ اس کا ایک جزو ہے اور اس اصل مسئلے کے بارے میں تبدیلی کے لیے زینے کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر ریاست کی بنیاد دین پر ہے اور خدا کی حاکمیت کے اصول کی روشنی میں نظام حکومت کو چلنا ہے تو پھر قیادت اور اجتماعی فیصلہ کرنے والے اداروں میں نمایندگی کا انحصار بھی مذہب، تہذیب و تمدن اور اجتماعی نظام کے نظریاتی رخ پر ہوگا۔ دونوں ایک دوسرے سے اسی طرح مربوط ہیں جس طرح ناخن سے گوشت اور پھول سے اس کی خوشبو۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان ہو یا بھارت، جداگانہ اور مخلوط انتخاب کی ساری بحث دینی اور قومی نمایندگی کے محور پر ہی گردش کرتی رہی ہے۔ جن عناصر کی طرف سے آج یہ بات اٹھائی جا رہی ہے وہ اعلانیہ طور پر سیکولرزم اور دین اور سیاست کی دوئی اور علیحدگی کے علم بردار ہیں، جب کہ وہ تمام افراد اور جماعتیں جو سیاسی نظام کے لیے دین کی رہنمائی کو ضروری سمجھتے ہیں، وہ جداگانہ طریق انتخاب، یعنی نمایندوں کا دینی اور قومی تشخص کی بنیاد پر انتخاب، ضروری سمجھتے ہیں۔

اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت ایک بدیہی امر اور اسلامی ریاست کی دینی ذمہ داری ہے لیکن چند اقلیتی عناصر کو خوش کرنے کے لیے ریاست کی بنیاد کو تبدیل یا کمزور کرنا قومی خودکشی کے مترادف ہے اور پاکستان کے تصور اور تحریک پاکستان کے رہنما نظریے کے خلاف ہے۔ قائداعظم نے صاف الفاظ میں کہا تھا:

> جس دن ہندستان میں پہلے غیر مسلم نے اسلام قبول کیا اسی لمحے پاکستان کے قیام کا آغاز ہو گیا۔ جوں ہی ایک ہندو نے اسلام قبول کیا، اسے نہ صرف مذہبی اعتبار سے بلکہ معاشرتی، ثقافتی اور اقتصادی لحاظ سے بھی اچھوت قرار دے دیا گیا۔ جہاں تک مسلمان کا تعلق تھا، اسلام نے اس پر یہ فرض عائد کر دیا کہ وہ اپنی شناخت اور انفرادیت کو کسی اجنبی معاشرے میں ضم نہ کرے۔ زمانہ قدیم سے عہد بہ عہد ہندو، ہندو رہے اور مسلمان، مسلمان۔ انھوں نے اپنی شخصیتوں کو ایک دوسرے میں ضم نہیں کیا۔ یہ ہے بنیاد پاکستان کی (علی گڑھ میں خطاب، مارچ ۱۹۴۴ء بحوالہ Speeches and Writings of Mr. Jinnah، ج ۳، ص ۲)۔

کیا کوئی سمجھ دار آدمی اس کا تصور کر سکتا ہے کہ اگر یہ فرق پاکستان کی بنیاد ہے تو پاکستان کے بنتے ہی یہ بنیاد غائب ہو جائے گی اور جو دھارے ہزار سال نہ مل سکے وہ مل کر ایک قوم بن جائیں گے۔ کیا ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد قرآن اور اسوۂ رسالت مآبؐ بدل گئے؟ کیا ہمارے خیروشر کے پیمانے تبدیل ہو

گئے؟ کیا حرام و حلال میں تبدیلی واقع ہو گئی؟ کیا تاریخ و ثقافت نے رنگ بدل لیا؟ کیا آرٹ اور فن تعمیر نے چولا بدل لیا؟ اگر نہیں تو پھر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے انتخاب' نمایندگی اور ترجیح کے پیمانے آخر کیوں ایک ہو جائیں۔

اقلیتوں کو ان کے جائز حقوق دینا ہماری ذمہ داری ہے اور خدا اور خلق سے ہمارا عہد ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ریاست کی بنیادوں کو منہدم کر دیا جائے' اس کی منزل کو تبدیل کر دیا جائے اور خود مسلمانوں سے جو عہد کیا گیا ہے اسے دریا برد کر دیا جائے۔ پاکستان کے پہلے وزیراعظم اور قائداعظم کے دست راست خان لیاقت علی خاں نے دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد کی تحریک پیش کرتے ہوئے صاف الفاظ میں کہا تھا:

> اس معاملے میں بابائے قوم قائداعظم نے کئی موقعوں پر اپنے جذبات کا اظہار کیا اور قوم نے ان کے خیالات کی بالکل واضح الفاظ میں توثیق کی۔۔۔ قائداعظم اور مسلم لیگ کے دوسرے رہنماؤں نے اس امر کے حوالے سے غیر مبہم اور واضح اعلانات کیے کہ پاکستان کے لیے مسلمانوں کا مطالبہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ مسلمانوں کا اپنا طریقہ حیات اور طرز معاشرت ہے۔ انھوں نے اس بات کو بھی بار بار دہرایا کہ اسلام محض فرد اور اس کے خدا کے درمیان ایسا رشتہ نہیں ہے جو ریاست کے معاملات کو متاثر نہ کرتا ہو۔

اور قائداعظم کے دوسرے معتمد ساتھی سردار عبدالرب نشتر نے دستور ساز اسمبلی میں ۱۰ مارچ کو اپنے خطاب میں کہا تھا:

> یہ صحیح ہے کہ قائداعظم نے اقلیتوں کو ضمانت دی تھی' لیکن قائداعظم نے اکثریت کو بھی اسی طرح ضمانت دی تھی۔ پاکستان کا مطالبہ ایک متعین نظریہ حیات اور متعین مقصد کی خاطر کیا گیا تھا اور یہ قرارداد جو پیش کی گئی ہے ان سوچی سمجھی اور ٹھوس یقین دہانیوں کے مطابق ہے جو قائداعظم اور مسلم لیگ کے رہنماؤں نے اکثریت اور اقلیتوں کو کروائی تھیں۔

دین کی بنیاد پر دستور اور سیاسی نظام کی تشکیل اور دینی اور تہذیبی تشخص کے مطابق نمایندگی کا اصول اسی وقت طے ہو گیا تھا جب قرارداد مقاصد منظور ہوئی اور جس پر ہمارا دستور مبنی ہے۔ حسین شہید سہروردی اور ذوالفقار علی بھٹو کا مخلوط انتخاب مسلط کرنے کا اقدام ہندو قوتوں اور سیکولر عناصر کے آگے سپر ڈالنے اور پاکستان کے نظریے' مقاصد اور قرارداد مقاصد سے بے وفائی کے مترادف تھا۔ قومی اسمبلی اور سینیٹ کے متفقہ ووٹ کے ذریعے جداگانہ انتخاب کا احیا اس غلطی کی تصحیح تھی جو ماضی میں کی گئی تھی اور جس کا قوم نے عظیم خمیازہ بھگتا تھا۔ آج اس بحث کو اٹھانا ایک بار پھر نظریہ پاکستان اور دستور کی اساس پر تیشہ چلانے کے مترادف ہے اور اسلام اور ملکی مفاد دونوں کے منافی ہے۔

قرآن پاک نے ایک اسلامی ریاست میں نمایندگی کے اصول کو حسب ذیل الفاظ میں بیان کر دیا ہے:
یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ج (النساء ۴:۵۹) اے ایمان والو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو اللہ کے رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اصحاب امر ہیں۔

یہاں مِنْکُمْ کی نص صریح نے ہمیشہ کے لیے مسلمانوں میں سے مسلمانوں کے نمایندوں اور اصحاب امر کے انتخاب کے مسئلے کو طے کر دیا۔

اسی طرح قیادت اور اطاعت کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے واضح ہدایت دے دی:
وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَہٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَاتَّبَعَ ھَوٰہُ وَکَانَ اَمْرُہٗ فُرُطًا (الکہف ۱۸:۲۸) کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا کام حدود آشنا نہیں ہے۔

مسلمانوں کی قیادت کے اہل وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو خود ان میں سے ہوں، جن کے دل و نظر اللہ کے ذکر سے معمور ہوں، جو اپنی خواہش نفس کو اللہ کی دی ہوئی ہدایت کے تابع کریں اور جو ان حدود کی پاسداری کریں جو خدا اور اس کے رسولؐ نے مقرر فرما دی ہیں۔ صرف ایسے ہی لوگوں کو نمایندگی کے مقام پر فائز کیا جا سکتا ہے۔

ایک اور مقام پر فرمایا گیا:
اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا لا (النساء ۴:۵۸) اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں (یعنی ذمہ داری کے مناصب) اہل امانت کے سپرد کرو۔

ان ہدایات پر عمل صرف جداگانہ انتخاب یا کسی ایسے انتخابی عمل ہی میں ممکن ہے جس میں مسلمان اپنے نمایندے خود منتخب کریں اور اسی طرح دوسرے مذاہب کے پیرو بھی اپنے مذہب اور تہذیبی مزاج کے مطابق اپنوں میں سے اپنے نمایندے منتخب کریں۔

اتنی صاف بات کو خلط مبحث سے پراگندہ کرنے کے لیے چند دانش ور بڑے دور کی کوڑی لائے ہیں اور ارشاد فرمایا ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے میثاق مدینہ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک امت قرار دیا تھا اور اسی کی روشنی میں آج بھی ایک اسلامی ریاست میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک امت تصور کر کے مخلوط انتخاب کا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اس مضحکہ خیز دلیل پر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ:

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے؟

معلوم ہوتا ہے کہ جو حضرات یہ بات بڑے زور و شور سے پیش کر رہے ہیں انھوں نے میثاق مدینہ کا مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور محض عنوان دیکھ کر یا سنی سنائی باتوں پر فتویٰ صادر فرما رہے ہیں۔ اس میثاق میں تو مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک مشترک نظام میں ان کے جداگانہ تشخص کی بنیاد پر مربوط کیا گیا ہے اور ہر ایک کے جداگانہ تشخص کا ہر معاملے میں لحاظ رکھا گیا ہے۔

اس معاہدے میں ایک طرف مسلمانوں اور غیر مسلموں کے ایک سیاسی نظام میں مل کر رہنے کا واضح نقشہ موجود ہے تو دوسری طرف مسلمانوں اور غیر مسلموں کے اپنے اپنے جداگانہ وجود کی مکمل حفاظت اور مالی ذمہ داری تک میں علیحدہ علیحدہ نظام کو برقرار رکھا گیا ہے۔ یہ مخلوط نظام کا نہیں' مختلف مذہب کے پیروؤں اور قوموں کے درمیان اپنا تشخص برقرار رکھتے ہوئے منصفانہ اشتراک اور تعاون کا ایک ماڈل ہے۔ مشترک شہریت' اسلام کی بالادستی' نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم اور آخری اتھارٹی تسلیم کیا جانا اور ہر ہر گروہ کے مساوات اور انصاف کے مطابق حقوق و فرائض اور مالی ذمہ داریوں کا تعین' ان ساری تفصیلات کو دیکھنے کے بعد اگر کوئی اسے مخلوط طریق انتخاب کے لیے نمونہ اور دلیل قرار دینے کی جسارت کرتا ہے تو یہی کہا جا سکتا ہے "شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد" اور

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو' جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ہم نے مندرجہ بالا صفحات میں اپنی بات برعظیم کی تاریخ' تحریک پاکستان کی نظریاتی اساس' قائدین تحریک کے وعدوں اور اعلانات' اسلامی ریاست کے مزاج اور مفاد اور پھر قرآن و سنت کے احکام اور نمونے کی روشنی میں کی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سیکولر جمہوریت کے علم برادروں کو خود مغرب کی سیاسی فکر اور لبرل جمہوریت کے اصولوں اور تجربات کا آئینہ بھی دکھا دیا جائے تاکہ ان کے ترکش میں یہ تیر بھی باقی نہ رہے کہ جداگانہ انتخاب کا نظام تو محض مذہبی جنونیوں کے ذہن کی اختراع ہے اور لبرل جمہوریت جس مساوات کی بات کرتی ہے' یہ اس کی ضد ہے۔

یہ دعویٰ کہ مغربی طرز کے جمہوری نظام میں اگر سب شہریوں کو بلالحاظ ان کے عقائد' زبان' نسل' تہذیبی اور ثقافتی تشخص کے ووٹ کا حق دیا جائے تو اقلیتوں کو حقیقی مساوات حاصل ہو جاتی ہے اور اکثریت اور اقلیت کا تصادم اور استحصال ختم ہو جاتا ہے' ایک خواہش تو ہو سکتی ہے مگر حقیقت کی دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ امریکہ کی میری لینڈ یونی ورسٹی کے علم سیاست و حکمرانی کے پروفیسر ٹیڈ رابرٹ گور (Ted Robert Gurr) نے برسوں کی تحقیق کے بعد ایک کتاب Minorities at Risk (اقلیتیں معرض

خطر میں) لکھی ہے جو ۱۹۹۳ء میں واشنگٹن سے شائع ہوئی ہے۔ دنیا کے ۲۳۳ اقلیتی گروہوں کے حالات کا تحقیقی مطالعہ کرنے کے بعد پروفیسر گور لکھتا ہے کہ گذشتہ ۵۰ سال میں اقلیتوں کے مسائل میں اضافہ ہوا ہے جو تصادم اور تشدد پر منتج ہوا ہے۔

یونی ورسٹی آف اوٹاوا کے سیاسی فلسفہ کے پروفیسر ول کیم لیکا (Will Kymlicka) جسے ۹۵-۱۹۹۴ء کا نظریہ سیاسی کا میک فرسن (Macpherson) انعام دیا گیا ہے، واضح اور مدلل انداز میں صرف جداگانہ انتخاب ہی نہیں، کثیر ثقافتی شہریت (multicultural citizenship) کا نظریہ پیش کر رہا ہے۔ اس کی کتاب Multicultural Citizenship (کثیر ثقافتی شہریت) ۱۹۹۹ء میں آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس سے شائع ہوئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آج دنیا کے ۱۸۴ ممالک میں ۶۰۰ لسانی گروہ اور ۵ ہزار نسلی گروہ پائے جاتے ہیں جہاں اقلیتوں اور اکثریتی گروہوں میں مسلسل کشمکش اور تصادم کی کیفیت ہے اور لبرل جمہوریت اس کا کوئی حل پیش نہیں کر سکی ہے۔

جمہوری نظاموں میں جب تصورات اور زمینی حقائق میں مطابقت نہیں ہوتی تو پھر اقلیتوں کے وجود کو ختم کرنے (physical elimination) کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے تاکہ معاشرے میں یکسانی و یک رنگی پیدا ہو جائے۔ اس کا راستہ بڑی تعداد میں ملک بدری، نسلی تطہیر اور اجتماعی قتل و خون ریزی رہا ہے۔ جہاں یہ نہیں ہوا وہاں اقلیتوں کو عملاً جبری طور پر اکثریت کی زبان، مذہب اور طور طریقوں کو قبول کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔

لبرل مفکرین کو توقع تھی کہ انسانی حقوق کے تحفظ کے عالمی اور قانونی اقدامات سے اقلیتوں کو تحفظ حاصل ہو گا مگر اقوام متحدہ کا اعلامیہ قومی اقلیتوں کے حقوق کے تصور سے خالی ہے۔ اب یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کو محض انسانی حقوق کے ذریعے محفوظ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے بالکل نئے انداز میں غور و فکر کی ضرورت ہے۔

ہارورڈ یونی ورسٹی کے مشہور فلسفی جان راولز (John Rawls) کی معرکہ آرا کتاب A Theory of Justice نے گذشتہ ۳۰ سال میں انصاف کے مسئلے پر مغرب کے سوچنے کے انداز کو متاثر کیا ہے، اس نے اپنی کتاب میں، جو ابھی شائع ہوئی ہے، لبرلزم کے ساتھ لبرل امپریلزم کے خدوخال بھی نمایاں کیے ہیں۔ اس نے عالمی نظام اور اس کے شریک ممالک اور ایک ملک کے اندر پائے جانے والے دینی، تہذیبی، نسلی اور لسانی گروہوں کے بارے میں جس منصفانہ نظام کا نقشہ پیش کیا ہے وہ کثیر قومی ہیئت (pluralism) ہے۔ اس کا خیال ہے کہ سیاسی وحدت کے تصور کا محل قوم کی جگہ انسانی گروہ کو قرار دیا جائے تو زیادہ حقیقت پسند اور منصفانہ نظام وجود میں آ سکتا ہے۔

سیاسی فکر کے یہ تمام رجحانات ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہونے چاہییں جو کنویں کے مینڈک کی طرح لبرل جمہوریت اور مساوات کے نام پر مخلوط انتخاب کی دہائی دے رہے ہیں اور محض تنگ نظری اور ضد میں جداگانہ انتخاب پر غیر جمہوری اور مبنی بر تفریق و امتیاز ہونے کی تہمت لگا رہے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ان کا رویہ دلیل اور تاریخی حقائق سے مطابقت نہیں رکھتا اور محض تعصب کی عینک سے وہ ایک معقول اور انصاف اور حقیقت پر مبنی نظام کی مخالفت کر رہے ہیں۔

آخر میں ہم یہ بات بھی کہنا چاہتے ہیں جس پلورلزم کی ہم بات کر رہے ہیں اور جس کے لیے جداگانہ انتخاب ایک اہم ذریعہ ہے' اس کے حاصل کرنے کا ایک اور طریقہ متناسب نمایندگی کا نظام بھی ہے جس میں پارلیمنٹ میں ہر مکتب فکر کی نمایندگی اس کی زمینی اور حقیقی قوت کے مطابق ہو جاتی ہے۔ متناسب نمایندگی کے نظام میں پاکستان کے حالات کی روشنی میں دیگر بہت سے فوائد بھی ہیں جنھیں ہم اپنی کتاب Proportional Representation and the Revival of Democratic Process in Pakistan (متناسب نمایندگی اور پاکستان میں جمہوری عمل کا احیا) میں پیش کر چکے ہیں۔ متناسب نمایندگی کے نظام کے ذریعے ساری خرابیوں کی اصلاح ممکن نہیں لیکن موجودہ نظام کی بہت سی خرابیاں ضرور اس سے دور ہو سکتی ہیں اور عوامی اداروں میں بہتر نمایندوں کے آنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ سیاسی پارٹیوں کے نظام کو مستحکم کرنے میں بھی اس سے مدد مل سکتی ہے۔ البتہ سیاسی جماعتوں کے لیے خود کو زیادہ جمہوری بنیادوں پر منظم کرنا' اپنی کارکردگی میں زیادہ شفافیت (transparency) پیدا کرنا اور عوام اور عدالتوں کے سامنے جواب دہی میں اضافہ بھی ضروری ہوگا۔ جمہوریت کے فروغ اور ارتقا کے لیے نظام انتخاب کی اصلاح بے حد ضروری ہے۔ ان تمام امور کو پاکستان کے حالات اور ضروریات اور اسلام اور معروف جمہوری اصولوں کی روشنی میں جلد از جلد طے کرنے کی ضرورت ہے تاکہ قوم عملی تبدیلیوں کی طرف پیش قدمی کرے۔

اس تحریر کے کچھ حصے حذف کیے گئے ہیں۔ مکمل تحریر کا کتابچہ دستیاب ہے: منشورات' منصورہ' لاہور

اشارات کے انگریزی ترجمے کے لیے دیکھیے: www.jamaat.org